



## فہرست

مشور شخصیات

۱. کرکٹ.....

معاشرہ و ثقافت

۲. اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء.....

۳. اکرم سہیل اور عصری تاریخ.....

۵. سائنٹ کٹر.....

۶. شوگر مافیا کا عروج اور کپاس کا زوال.....

۷. ہمارا گھر مندر بن گیا تھا.....

---

مصنف: سفیان خان

1

## اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء

مصنف: علی احمد

یہ کالج نہیں بنجائے گا  
تم ایک مجھے بہتری ہو  
اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشاء 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ٹوکیو بک ڈسٹریبیوٹرز پروگرام کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگرام ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ 1969ء میں آپ نے دوسری شادی کی دوسری بیگم کا نام شکلیہ بیگم تھا۔ دوسری بیوی سے آپ کے دو بیٹے سعدی اور رومی پیدا ہوئے۔ کسی حد تک یہ پسند کی شادی تھی۔ ابن انشاء کی شاعری میں ایک جادو ہے۔ ان کی بات ہی الگ ہے۔ کیا کمال کا شاعر تھا اور کیا کمال کی شاعری ہے۔

دل جبر کے درد سے بوجھل ہے، اب آن ملو تو بہتر ہو  
اس بات سے ہم کو کیا مطلب، یہ کیسے ہو، یہ کیونکر ہو  
انشاء جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے  
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ آوارہ گرد کی ڈائری۔ دنیا گول ہے۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ چلنے ہو تو چین کو چلئے۔ نگری نگری پھرا مسافر۔ آپ سے کیا پردہ۔ غمار گندم۔ اردو کی آخری کتاب۔ خط انشا جی کے۔ اس کے علاوہ آپ نے متعدد تراجم بھی کیے (اندھا کنواں اور دیگر پر اسرار کہانیاں۔ مجبور۔ لاکھوں کا شہر۔ شہر پناہ چینی نظمیں، سانس کی پھانس، وہ بیٹیوی تصویر، عطر فروش دوشیزہ کے قتل کا معرہ، قصہ ایک کنوارے کا۔ کارناسے ناب تیس مار خان کے۔ شلجم کیسے اکھڑا بچوں کیلئے ایک پرانی روسی کہانی کا ترجمہ۔ یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟۔ قصہ دم کٹے چوہے کا۔ میں دوڑتا ہی دوڑتا۔ اختر کی یو میں، اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کرنے کا بھی اعزاز ابن انشاء نے ہی حاصل کیا۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا  
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا گھر میں ٹھکانہ کیا

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو نظم کہنے کے ایک ماہ بعد ابن انشاء کی وفات ہوئی۔ اردو ادب کا یہ بے حد مقبول و اہم شاعر و ادیب، مزاح نگار، جس نے اپنی زندگی کے زیادہ تر ایام حالانکہ اپنے شہر کراچی، لاہور یعنی پاکستان میں گزارے، مگر جب اجل کا وقت قریب آیا تو وہ اپنے وطن سے سات سمندر پار انگلستان میں مقیم تھے۔ وہیں انہوں نے 11 جنوری 1978ء کو لندن میں وفات پائی اور پاپوش نگر قبرستان، کراچی میں آسودہ خاک ہیں۔ یہ عظیم شاعر و ادیب افسانہ نگار ابن انشاء جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے 39 برس بیت گئے ہیں مگر وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ آج بھی زندہ ہے۔

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جانی ہے

اس شہر سے دور

اک کنیا ہم نے بنائی ہے

اس اس کنیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

سب مایا ہے۔۔۔!!!

اردو ادب کے مایہ ناز شاعر، ادیب ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خان تھا لیکن ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ 15 جون 1927ء کو جالندھر کے ایک نوابی گاؤں کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی خان تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول میں، مڈل نزدیکی گاؤں کے سکول سے اور 1941ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ابن انشاء کو صحافت، علم و ادب سے دلچسپی تھی، اس وقت "نوائے وقت" ہفت روزہ تھا، حمید نظامی صاحب سے خط و کتابت تھی، انہوں نے ایک خط میں حمید نظامی صاحب (مرحوم) سے لاہور آکر "نوائے وقت" میں ملازمت اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حمید نظامی کے مشورے پر ابن انشاء لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا، ان کی رہائش کا بندوبست جناب حمید نظامی نے کیا مگر تین مہینے کے مختصر قیام کے بعد ابن انشاء اپنی طبیعت کے مطابق اور کچھ دیگر وجوہات کے سبب تعلیم اوصوری چھوڑ کر لدھیانہ چلے گئے۔

وہاں بھی بھروسے نے کہاں رہنا تھا، لدھیانہ سے اقبال چلے گئے، وہاں ملٹری اکیڈمی کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور دلی چلے گئے۔ اس دوران میں آپ نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر پی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ ابن انشاء ذہین تھے، تھوڑے عرصے بعد انہیں اسمبلی ہاؤس میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سیکشن میں خبروں کے انگریزی بلٹن کے اردو ترجمے پر مامور ہوئے اور قیام پاکستان تک وہ آل انڈیا ریڈیو ہی سے وابستہ رہے۔ آپ کی پہلی شادی 1941ء میں لدھیانہ میں عزیزہ بی بی سے ہوئی، عزیزہ بی بی سے ابن انشاء کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی، بعد ازاں گھریلو ناچاکی کے سبب دونوں کی طبیعت میں فرق کے سبب عزیزہ بی بی اور ابن انشاء میں علیحدگی ہو گئی، مگر طلاق نہ ہوئی، لہذا عزیزہ بی بی نے باقی تمام عمر ان کی بیوی کی حیثیت ہی سے زندگی بسر کی لیکن ان سے الگ رہیں۔

جب پاکستان بنا تو ابن انشاء اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی، انڈیا میں ریڈیو سے منسلک رہے تھے، اس لیے بھاگ دوڑ کر کے 1949ء میں وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن سے بطور مترجم منسلک ہوئے۔ کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا، اپنی اوصوری تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اردو کالج کراچی میں 1951ء میں ایم اے اردو کی شام کی جماعتوں میں داخلہ لے لیا اور 1953ء میں ایم اے کا امتحان کیا پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی کام کرنے کا سوچا بھاگ دوڑ کر کے مارچ 1954ء میں بعنوان (اردو نظام کا تاریخی و تنقیدی جائزہ (آغاز تا حال) کا مقالہ ملا مگر وہ اپنے اس مقالے کو مکمل نہ کر سکے کچھ عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔ دور جدید کے مسائل سے بھی ابن انشاء آگاہ تھے، اس کے لیے کالم نگاری کا راستہ اختیار کیا۔ وہ مختلف اخباروں کے لیے بڑی پابندی سے کالم لکھا کرتے تھے اور اپنی بے باک رائے پیش کیا کرتے تھے۔ کالم نگاری آخری عمر تک جاری رہی۔

ابن انشاء نے 1960ء میں روزنامہ "مرود" کراچی میں درویش دمشقی کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا۔ 1965ء میں روزنامہ "انجام" کراچی اور 1966ء میں روزنامہ جنگ سے وابستہ گی اختیار کی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔ دو شعری مجموعے، چاند نگر اور اس بستی کے کوچے میں 1976ء شائع ہو چکے ہیں۔ 1960ء میں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔ کیا جھگڑا سود خسارے کا

## اکرم سہیل اور عصری تاریخ

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

کہتے ہیں کہ ایک بار اشرف صوبی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے۔ وہاں انہوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی جو کسی الماری میں تالا بند تھی۔ حفیظ جالندھری صاحب نے پیٹھے پیٹھے ہانک لگائی۔۔۔ پیگم ذرا چابی دینا، ایک کتاب نکالنی ہے۔ اس پر صوبی چپک کر بولے "ہاں ہاں ضرور چابی دیجیے یہ بھی اب چابی کھلونا بن گئے ہیں۔ چابی کے بغیر چل نہیں سکتے"

یہ تو گئے زمانوں کی بات ہے جب ٹیکنالوجی ذرا کم ترقی یافتہ تھی اور ان دنوں مارکیٹ پر جاپان چھایا ہوا تھا۔ اب معاملہ ذرا اور آگے بڑھ گیا ہے۔ ایک طرف چین کا سایہ ہے تو دوسری طرف ریوٹ کا دور دورہ۔ اسلئے اب ہمیں ہم تم کرے میں بند ہوں اور چابی کھو دیں جیسے گیت سننے کو نہیں ملتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب "ٹچ" سسٹم چل رہا ہے۔ سو اب "ٹچ می ناٹ" بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تو صوبی کا ٹھٹھا اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ اب عمومی طور پر سوچ و عمل کے باب میں کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ صاف نظر آتا ہے کہ ریوٹ کہیں اور ہے حرکت کہیں اور۔۔۔ اس بے حس و جامد کیفیت میں کچھ فرزانے بلکہ دیوانے ایسے ہوتے ہیں جو "کل جاسم سم" کا اسم اعظم الاچتے سناتے دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں۔ کہ شاید کہیں کوئی جنبش ہو اور کوئی روک بندش کھلے۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ جو کہنے کو کئی سال بیوروکریسی میں گزارا بلکہ گنوا کر آیا ہے۔ لیکن ایسا کلاما "نیا" کہ برسوں پہلے دیکھے خواب سنبھالے پھرتا ہے۔ اسے گمان ہے کہ اس کے خواب نئے اجالوں کے سفیر ہیں۔ اس کا گمان وقت کے ساتھ ساتھ ایقان میں بدلا سو وہ کہنے کے قابل ہوا۔

میں وہ جانتا ہوں حقیقتیں جو اس ارض بے نوا کی ہیں گر دل میں رکھ کے ہی سو گیا تمہیں کون پھر یہ بتائے گا اس نے اپنے خوابوں کا انتساب کچھ ایسا کیا کہ سب ظاہر باہر ہو گیا۔ مشہور پہاڑی آخان ہے کہ "تمنیاں ناں بالا نیدی اے اپنا" اس کی فکر و شاعری کے باب میں یہ آخان مکمل طور پر صادق آتا ہے کہ اس کا حرف حرف لفظ لفظ اس کی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

وہ "حمز" لکھتا ہے تو کہتا ہے کسی نے لو جو لگائی تو اس کو دار ملی کہیں تو نوک سناں تن کے آر پار ملی وہ تیرے نام کا صدقہ اتارنے کے لئے دیا تھا دل تو چلے جان وارنے کے لئے اور "نعت" کہے تو یوں گویا ہوتا ہے۔ قاطع عہد غلامی وہ بشیر اور نذیر عہد ظلمات میں وہ شمس الضحیٰ کی تنویر ظلم کا ہاتھ جھٹک دینے کی توفیق ملی بند سوچوں کو بھی پھر جرات تحقیق ملی غالباً

اسی متبرک سوتے سے تحقیق و تخلیق کی جرات پا کر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اس کا اسم اعظم کام کر جاتا ہے۔ وہ کل جا سم سم کہتا ہے تو ملکی حالات، تاریخ، تحریک اور سیاست کے بند در اس کے سامنے کچھ یوں داہوتے ہیں کہ وہ سات پردوں میں ہونے والے معاملات کو بھی دیکھ سمجھ لیتا ہے۔ اس کی پرکھ کی یہ صلاحیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ مجھے "حکایت" کے صابر راجپوت کی کہانیوں کا "کھوجی" لگتا ہے جو کھرا اُٹھتا ہے، تو ملکی وسائل لوٹنے والوں کے گھریں تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سمجھ بوجھ کو جب اپنی اہلیت اور فنی ریاضت کے سہارے شاعری کا چیر ہن پہناتا ہے تو وہ سنور نکھر کر یوں سامنے آجاتی ہے کہ سیاہ اندھیرے میں چاندنی سی چمک چمک بن جاتی ہے۔

وہ فکری طور پر راسخ ہے سو اسے کر بلا حریت کا استعارہ لگتا ہے اور اسے یہ جرات بھی حاصل ہے کہ وہ فیض سے پوچھ پائے کہ "کب راج کرے کی خلق خدا" حریت اور فیض کا تذکرہ آیا تو یہ کہنا حق بنتا ہے کہ وہ ترقی پسند فکر کا حامل شخص و شاعر ہے اسی لئے اس کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے اور وہ جرات و ہمت کو رہبر کر کے خلق خدا کی حالت بدلنے کی آس رکھتا ہے۔ وہ شہر کے قلم کاروں کو حرمت لفظ کا اٹن بتاتا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ "جی روح اوہے جے فرشتے" یعنی جیسا تو ویسے حکمران باہ۔

! ائن انشا کہنا ہے کہ حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا سو ہم بحیثیت مجموعی وہ محتاط و منافع لوگ ہیں جو ہر سو ظلم کی پلاشتاں دیکھ کر اسے غلط تک کہنے سوچنے سے بھی گریزاں ہیں کہ مبادا یوں نہ ہو جائے مبادا وہ نہ ہو جائے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ بتایا ہے کہ وہ اس "احتیاط" سے ممکنہ طور پر بچا رہا ہے۔ اور اس کی یہ عادت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ لہذا اس کا لکھا حرف حرف لفظ، شعر، نظم، قطعہ، غزل سبھی کچھ ایک خاص فکر کا غماز ہے۔ وہ اب برائے زندگی کا قائل بلکہ اس سے گھماں ہے۔ سو اس کے سارے موضوعات زندگی بلکہ کرب انگیز زندگی سے کشید ہوئے ہیں۔ اسلئے اس کی شاعری میں صداقت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ وہ جانتا ہے کہ "حکم شامی" یوں ہی ملتا ہے۔

حکم شامی ہے مرا جشن منایا جائے میرے ارمانوں کا ایک تخت بچھایا جائے میرے احکام کی تعمیل مگر ہو ایسے سی سختی کسی کاغذ پہ نہ لایا جائے ایسی ہستی کہ جہاں لوگ ہوں گستاخ بہت ایسا گھر کوچ و بازار جلایا جائے \* وہ بھی کچھ ایسا ہی "گستاخ" ہے مگر اس نے ہر بات نہایت سجود پنے سے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فکر عمومی طور پر اس کے بیان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

یوں تو "نئے اجالے ہیں خواب میرے"۔ دس حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے تمام حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ اس کا موضوع مظلوم ملک و لوگ ہیں اور مظلوموں

کے درد سانچے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فطری اتحاد ہونا بھی لازمی امر ہے لیکن اس کے دو خصوصی حصے جو کشمیریات یعنی کشمیر کی تحریک آزادی اور یہاں کے قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کا احوال بیان کرتے ہیں، خاصے کی چیز ہیں۔

کہتے ہیں کہ افغانستان کے جہاد اور روس کے سقوط کا اصل سبب کسٹین میں پایا جانے والا سنہری سیال ہے۔ اس طرح ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا میں آئندہ جنگیں پانیوں پر ہوں گی۔ ان دو حوالوں کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جائے تو گزشتہ کئی سالوں سے کشمیر کی مایلوں اور نالوں پر قبضے کا ایک خاموش عمل آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل وہ ہے جسے اس نے "وائر لائڈرنگ" کا نام دیا ہے۔ اس نے پہلی بار اس اہم اور بے حد حساس معاملے کو دیکھا اس پر سوچا اور پھر پوری جرات سے لکھا۔ یوں مجھے اس کی شاعری کشمیر کی عصری تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس عصری تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو مجھے شعوری طور پر یہ عمل ایک نئے کشمیر کی دریافت لگتا ہے۔

اکرم سہیل کی شاعری میں نظم و قطعے کا پلا ذرا بھاری ہے۔ اس کی نظم ہنگامی و موضوعاتی نوعیت کی ہے۔ یوں وہ مولانا ظفر علی خان کی راہ کا راہی کہلا سکتا ہے۔ لیکن بلند آہنگی اور پر شکوہ انداز کے باعث اور غالباً فطری میلان میں یکسانیت کے سبب وہ غیر محسوس انداز میں جوش کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی نظم و قطعے کا باہم مطالعہ گزشتہ دو تین دہائیوں کی تاریخ کے وہ در واکرتا ہے جو عمومی طور پر ڈاڈے باٹے کر کے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اپنی طبیعت اور شخصیت میں وہ حلیم و متوازن شخص فیض اور احمد ندیم قاسمی کا مقلد لگتا ہے۔ فیض جو اب برائے زندگی کے قافلے کا سرخیل تھے کہ متعلق کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ وہ علم، حلم اور نظم کا آمیزہ تھے تو اسی طرح رب کی مہربانی سے کھلی آنکھوں سے ندیم کو بار بار دیکھا تو یہ جانا کہ فنی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کیا ہوتا ہے۔ اکرم سہیل شخصی حوالوں سے ان سے متاثر لگتے ہیں لیکن مزاحمتی شاعری میں ان پر غالب ذرا زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ شاید حالات کی سختی اور تلخی نے ان کے لہجے کو ذرا تند کر دیا ہے، ورنہ یوں تو وہ ریلے ٹپھے شخص ہیں۔

اکرم سہیل جب کشمیر کہانی کہتے ہیں تو وہ یہاں کے بے پانی کو نہیں بھول پاتے جو ہائڈرل جزییشن کی نجکاری کی صورت میں دے دیا گیا، اسی لئے ان کا کہنا ہے۔

نالہ صدیوں سے ہے دلگیر میرا جسم بھی پایہ زنجیر میرا جس کے پانی پہ میرا حق ہی نہیں کیسے کشمیر و کشمیر میرا مسئلہ کشمیر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کیا رخ بھی یہ دیکھا ہے کشمیر کہانی کا باقی ہیں یہ سب نعرے مسئلہ ہے یہ پانی کا یا پھر میری دھرتی کی ایک ہی دولت ہوس زر کا وہی شکار ہوئی کیسے قبضے میں غیر کے آئی یہ حقیقت بھی

آشکار ہوئی اکرم سہیل نے کشمیر کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کو پہلی بار موضوع شاعری بنایا۔ سو وہ کہتے ہیں۔

میرے دریاؤں کی باتیں ، میرے اشجار کی باتیں میرے یا قوت کی باتیں، میرے مرجان کی باتیں جو ہو قومی وسائل لوٹا مقصد ہی جب ان کا کہاں بھاتی ہیں ان کو قاعدہ قانون کی باتیں اکرم سہیل کی شاعری یقیناً کشمیر کے مزاحمتی ادب میں ایک بامعنی اضافہ ہے۔ جس کی گونج نہیں جلتی رنگ دور اور دیر تک سنائی دے گی۔ کہ اس میں کشمیر کے بہتے جھرنوں اور گنگناتی ندیوں کا ترنم و الم ہے اور اس کی تاثیر یقیناً گہری اور ڈاڈی ہے۔ کہ یہ دھرتی کے سینے پر رقم وہ تحریر ہے جسے محسوس کئے بنا آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

§§§

## سائنٹ کلر

مصنف: علی احمد

جرمن ماہر ڈاکٹر لوزل کا کہنا ہے جرمنی میں پانچ لاکھ افراد اس بیماری کے ابتدائی علاج کے دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ایک لاکھ مبتلا ہونے کے بعد زیر علاج ہیں نتائج آنے میں وقت درکار ہوگا۔ طبی رپورٹ کے مطابق ان افراد کے پیٹ کی خاص رگ پانچ سینٹی میٹر تک پھولی ہوئی اور سوجن ہے جس کے سبب وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے اور ایسے مریضوں کا فوری آپریشن لازمی قرار دیا ہے تاہم کچھ مریضوں کا علاج تشخیص کے بعد شروع کیا جائے گا، لڑا ساؤنڈ سکین سے ڈاکٹروں نے اس بیماری کا پتہ لگایا ہے لیکن جرمنی میں صحت سے منسلک ادارے سکریننگ کرنے کی ڈاکٹروں کو ادائیگی نہیں کرتے اسلئے کئی مریضوں کو خود ادائیگی کرنا ہوتی ہے جو ایک مہنگا علاج ہوتا ہے تاہم روٹین چیکنگ کے دوران اتفاق سے بذریعہ لڑا ساؤنڈ اگر معلوم ہو جائے کہ مریض اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسکی ادائیگی صحت کا ادارہ کرتا ہے روٹین چیکنگ میں پیٹ کا لڑا ساؤنڈ یا گردے کی تکلیف سے مراد ہے۔ فیملی ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ پینٹھ برس سے زائد افراد کو باقاعدگی سے لڑا ساؤنڈ کروانا چاہئے اور خاص طور سے ان افراد کیلئے زیادہ اہم ہے جو موٹاپے میں مبتلا ہیں یا ذیابیطس ہونے اور بکثرت تمباکو نوشی کرتے ہیں یا کمر کے درد کی شکایت کرتے ہیں۔ پیٹ کے اندرونی نظام میں اکثر معمولی انفیکشن سے بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ انفیکشن کی صورت میں رگیں اکثر زیادہ پھول جاتی ہیں یا اتنی کمزور اور باریک ہو جاتی ہیں کہ پھٹ سکتی ہیں اور خون جاری ہونے کی صورت میں فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے، زیادہ تر مرد اس بیماری میں مبتلا ہیں کیونکہ مردوں کی روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین سے مختلف ہوتا ہے مثلاً حفظان صحت پر زیادہ توجہ نہ دینا وغیرہ۔ لڑا ساؤنڈ سے فوٹوز حاصل کرنے کے بعد دوسرا قدم کمپیوٹر ٹومو گرافی سے مطلوبہ رگ کا پتہ لگانے کے بعد آپریشن لازمی ہوتا ہے، پیٹ چاک کرنے کے بعد زخمی رگ کے ساتھ مصنوعی عضو کیمپس لگا دی جاتی ہے جس سے خون کی سرکولیشن جاری رہتی ہے اور پوزیشن تبدیل کر دی جاتی ہے، سنٹینٹ گرافٹ کا استعمال کرتے ہوئے اینڈو ویس کیو لری کو مبی نیشن سے رگوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور مریض تین سے سات دنوں میں فٹ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوزل کے مطالعے اور دستاویزی مواد کے پیش نظر ایک سو چوالیس افراد کے سنٹینٹ گرافٹ آپریشن ہوئے اور دو ہزار پندرہ میں اطالوی میگزین دی ایٹالین جرنل آف ویسکولر اینڈوویس کیولر سرجری کے عنوان سے شائع ہوئے جس میں تصدیق کی گئی کہ یہ ہی سائنٹ کلر کا کامیاب علاج ہے۔

§§§

یہ کسی فلم یا لیبٹ کا نام نہیں بلکہ دنیا بھر میں کئی انسان اس خاموش قاتل کے شکار ہیں اور یہ قاتل انسان کے وجود میں آنے کے بعد اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے انحصار اس بات پر بھی کرتا ہے کہ انسان کس خطے یا ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے روزمرہ کی مصروفیات کیا ہیں، کیا معقول اور صحت مند غذاؤں کا استعمال کیا جا رہا ہے، مکمل نیند لیتا ہے، اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں پچھلی بیماریاں قدیم ہونے کے ساتھ آج کل سائنس کی طرح ترقی بھی کر رہی ہیں سائنس اور ماہرین جتنا ان بیماریوں کی تہہ یا جڑوں میں جا کر ان کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے علاج کے طریقے دریافت کر رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے کئی بیماریاں انسانوں کی اپنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جنم لے رہی ہیں اور روز بروز کئی نئی بیماریاں کا شکار ہو کر انسان موت کے منہ میں جا رہے ہیں، کسی نے زیادہ کھا لیا تو بیمار ہو گیا کم کھا یا تو بیمار، زیادہ خواب و خرگوش کے مزے لیتا رہا تو بیمار نیند پوری نہیں ہوئی تو بیمار یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسان کچھ کرے یا نہ کرے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ البرٹ آئین سٹائن معمولی لیکن خطرناک حد تک پیٹ کی موٹی رگ کے پھیل اور سوج جانے سے موت کا شکار ہوا تھا۔ کئی بیماریوں کی اردو میں ٹرانسلیشن کرنا ناممکن ہونے کے ساتھ اردو میں لکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اگر حرف بہ حرف درست طریقے سے یعنی ججے کر کے نہ لکھا جائے تو مطالعہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے تاہم ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ انگریزی کے حروف کی درست اور صحیح الفاظ میں بامعنی لکھنے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح بھی کروں اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں اس کالم میں بھی کچھ ایسے پیچیدہ طبی الفاظ شامل ہیں جنہیں اردو رسم الخط میں تحریر کرنے میں کافی محنت کی ہے تاکہ دوران مطالعہ آسانی رہے۔ حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق پیٹ کے اندر پلٹے والی قدیم بیماری کا واضح طور سے مطالعہ کیا گیا جس کے نتائج منفی ظاہر ہوئے ہیں، جرمن ماہرین کا کہنا ہے صرف جرمنی میں پینٹھ برس سے زائد کے افراد جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اس بیماری میں مبتلا ہیں، پیٹ کی اس بیماری کو کسی بھی زبان میں ادا کرنا نہایت مشکل ہے جبکہ مکمل جانکاری حاصل کرنا اور زیادہ مشکل۔ اینڈو میٹل اینیو رسم جسے آڈرنک اینیو رسم بھی کہا جاتا ہے ایک مہلک اور جان لیوا بیماری ہے۔ زیادہ تر افراد اسکی علامات اور اثرات سے واقف نہیں کیونکہ یہ خاموشی سے جسم اور خاص طور پر پیٹ میں نہایت خاموشی سے پروان چڑھتی ہے اور اسی لئے اسے خاموش قاتل یعنی سائنٹ کلر کہا جاتا ہے۔



## شوگر مافیا کا عروج اور کپاس کا زوال

مصنف: علی احمد

سے کئی گنا آگے ہیں۔ کماد کی فصل 12 سے 16 ماہ میں تیار ہوتی ہے اور اس کے لیے اوسطاً 78 انچ فی ایکڑ پانی درکار ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں دیگر مقامی فصلوں کے لیے پانی کی ضرورت کا جائزہ لیں تو کپاس اوسطاً 39 انچ فی ایکڑ، مکئی 35 انچ فی ایکڑ، گندم، جوار اور باجرہ 21 انچ فی ایکڑ پانی سے تیار ہوجاتی ہیں۔ اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ کماد کی فصل کو باقی تمام فصلوں کی نسبت تین گنا زیادہ پانی کی ضرورت ہے لیکن اس کے باوجود ہر سال کماد کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کر کے ملک کو پانی کے بحران میں دھکیلنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اگر کماد کے زیر کاشت رقبہ کو محدود کر دیا جائے تو جہاں کپاس کی پیداوار میں اضافہ ہوگا وہاں ایک کثیر رقبہ پر اس دورانیہ میں گندم کی دو فصلیں کاشت کی جاسکتی ہیں جس کی وجہ سے پاکستان گندم میں خود کفیل ہوجائے گا۔

کسانوں کی کسمپرسی ملاحظہ کیجئے کہ چینی کی کم قیمتوں کی وجہ سے گئے کے کاشتکاروں کو اپنی فصل شوگر انڈسٹری کے صنعت کاروں کے رحم و کرم پر چھوڑنی پڑتی ہے۔ باثر افراد پر مشتمل شوگر ملز مافیا بیک وقت کم قیمت پر گنا خرید کر اور کسانوں کو منگنے داموں چینی فروخت کر کے ان کا استحصال کر رہا ہے۔ کسانوں کو گئے کی مناسب قیمت نہیں دی جاتی بلکہ معمولی قیمت کی ادائیگی کے لیے بھی مہینوں تک محروم رکھا جاتا ہے۔ شوگر ملز کروڑوں روپوں کی ناپائیدار ہیں کیوں کہ بیشتر شوگر ملزیں حکمرانوں اور سیاسی راہنماؤں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت پاکستان میں کل 85 شوگر ملز ہیں سے آدھی سیاستدانوں کی ملکیت ہیں۔ پنجاب میں شریف خاندان کی 9 شوگر ملز ہیں جبکہ سندھ میں چار شوگر ملز زرداری خاندان کی ملکیت ہیں اور ایک شوگر مل ذوالفقار مرزا کی ملکیت ہے۔ آئی ایس آئی کے سابق ڈی جی اختر عبدالرحمان کے دو صاحبزادوں ہارون اختر اور ہمایوں اختر کی دو شوگر ملز ہیں۔ تحریک انصاف کے مرکزی رہنما جہانگیر خان ترین کی دو شوگر ملز سابق چیئرمین پی سی بی ذکا شرف ایک شوگر مل کے مالک ہیں۔ سابق وفاقی وزیر عباس سرفراز خیبر پختونخوا میں موجود 8 میں سے 4 شوگر ملز کے مالک ہیں۔ اسی طرح اس کے علاوہ محرم احمد محمود، نصر اللہ دریشک، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری پرویز الہی اور میاں اختر سمیت کئی سیاستدان اور خاندان شوگر ملز کے مالک ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ٹیکسٹائل ملز کی نسبت شوگر مافیا زیادہ طاقتور ہے اور کپاس کی کاشت کرنے کے بجائے کماد کو ترجیح دیتے ہوئے ملکی معیشت کو تباہ کیا جا رہا ہے۔

موجودہ حالات میں کپاس کی پیداوار میں اضافہ کے لیے حکومت کو انقلابی اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ کپاس کی پیداوار کے لیے موزوں علاقوں بالخصوص جنوبی پنجاب میں کماد کی کاشت، شوگر ملز کی منتقلی اور نئی شوگر ملز لگانے پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ کماد کی فصل کے طویل دورانیہ اور پانی کی زیادہ ضرورت کی وجہ سے دنیا بھر میں چتندر کو چینی کے بہترین ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ پاکستان میں خیبر پختونخوا، سندھ اور پنجاب کے کچھ اضلاع کی آب و ہوا چتندر کی کاشت کے لیے سازگار ہے۔ چتندر کی فصل جلد تیار ہوجاتی ہے اور پاکستان میں اس کی اوسط پیداوار بھی زیادہ ہے اس لیے اسے چینی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے چتندر کی کاشت کو کماد کے متبادل کے طور پر فروغ دیا جانا چاہیے۔



کپاس ہمارے ملک کی ایک اہم نقد آور فصل ہے جس کا جی ڈی پی میں حصہ 1.7 فیصد ہے۔ ٹیکسٹائل کے شعبے میں کپاس کا مرکزی کردار ہے اور ٹیکسٹائل انڈسٹری نہ صرف ہمارے 66 فیصد برآمدات کا احاطہ کرتی ہے بلکہ 40 فیصد مزدوروں کو روزگار بھی فراہم کرتی ہے۔ ملکی آب و ہوا کپاس کے لیے سازگار ہونے کے باعث پاکستان عرصہ دراز سے کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا کے پانچ بڑے ممالک میں شامل رہا ہے لیکن گزشتہ پانچ سالوں میں کپاس کی پیداوار میں تشویشناک حد تک کمی نے ملکی معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ پاکستان میں گزشتہ برس کپاس کی فصل خاصی بہتر رہی اور 14.6 ملین گانٹھیں حاصل ہوئیں، لیکن مجموعی طور پر کپاس کی پیداوار میں 30 فیصد کمی واقع ہوئی جس کی وجہ سے ملکی معیشت کو 5 فیصد نقصان کا سامنا رہا۔ کپاس کی پیداوار تخمینہ سے کم ہونے کے باعث کپاس کے متوقع بحران سے نمٹنے کے لیے رواں سال 15 لاکھ گانٹھوں کے لگ بھگ بیرون ممالک سے روٹی کے درآمدی معاہدے کر لیے گئے ہیں۔ کپاس کی پیداوار میں عالمی شہرت کے حامل ملک کے لیے اربوں روپے کپاس کی درآمد پر خرچ کرنا حکومت کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

موسمی تغیرات اور ہر سال بیماریوں کے حملے کے علاوہ کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں بندرتج ہونے والی کمی کپاس کی پیداوار میں کمی کی بڑی وجہ ہے۔ سینٹرل کاؤن ریسرچ انسٹیٹیوٹ ملتان کے مطابق حالیہ سیزن میں کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں کمی کا بنیادی سبب گئے کے زیر کاشت رقبہ میں ہونے والا اضافہ ہے۔ ادارے کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال صوبہ پنجاب میں 15 لاکھ ایکڑ رقبہ پر گئے کی فصل کاشت کی گئی تھی، جبکہ رواں سال گئے کا زیر کاشت رقبہ بڑھ کر 18 لاکھ ایکڑ ہو گیا ہے۔ گزشتہ سال کپاس کے زیر کاشت رقبہ میں پنجاب میں 21 فیصد کمی اور ملک بھر کے مجموعی زیر کاشت رقبہ میں 15 فیصد کمی ہو گئی جو کپاس کی پیداوار میں کمی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ملکی پیداوار کے لحاظ سے صوبہ پنجاب میں کپاس کی کاشت کا رقبہ 80 فیصد ہے۔ کپاس کی فصل پر کیڑوں کے حملے سے بچا کے لیے حکومت نے محکمہ زراعت کی ہدایت پر صوبہ پنجاب میں کپاس کی قبل از وقت بوائی پر دفعہ 144 نافذ کر دی ہے۔ اگیتی کاشت پر پابندی کی وجہ سے کاشتکار کپاس کی بوائی کے لیے 15 اپریل تک انتظار کرنے کے بجائے کماد کی بوائی کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ کاشت کاروں کی ایک قابل ذکر تعداد اس حکومتی اقدام کو © "کاؤن بیلٹ" میں شوگر ملز لگانے والے مافیا کماد کاشت کو فروغ دلوانے کی سازش قرار دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے کماد کے بڑھتے ہوئے زیر کاشت رقبہ نے کپاس کی پیداوار کو شدید متاثر کیا ہے۔ کماد گرم مرطوب علاقے کی فصل ہے اور پنجاب گرم خشک علاقہ ہے یہاں اوسط سالانہ بارش بھی کم ہوتی ہے۔ امریکہ کی سٹینفورڈ یونیورسٹی کے محققین کے مطابق جس خطہ میں کماد کی فصل کاشت کی جائے وہاں درجہ حرارت کم اور آب و ہوا مرطوب ہوجاتی ہے۔ پاکستان میں کپاس کے کی کاشت کے لیے سازگار سمجھے جانے والے علاقوں میں کماد کاشت کرنے کی وجہ سے فضا میں نمی کا تناسب بڑھ چکا ہے جس کی وجہ سے آب و ہوا گرم مرطوب ہو چکی ہے۔ چونکہ کپاس کی فصل کے لیے گرم خشک آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے اس فصل پر ہر سال انتہائی خطرناک بیماریوں کا حملہ معمول بن چکا ہے۔

کپاس کے پیداواری علاقوں میں کماد کی کاشت کے فروغ کے لیے سرگرم عمل مافیا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان میں کماد کی فی ایکڑ اوسط پیداوار 639 من ہے جو کہ دیگر ممالک سے کئی گنا کم ہے۔ مصر، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، انڈونیشیا اور ملائیشیا میں فی ایکڑ اوسط پیداوار 1800 من سے زائد ہے جبکہ ہمارے ہمسایہ ممالک چین، بھارت اور بنگلہ دیش بھی اس دوڑ میں ہم



## ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

ایک مضمون دیکھنے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ ”گھروں سے دریافت ہونے والی عجیب اشیاء کوئی مالا مال تو کوئی خوف سے نڈھال“

اس میں مغربی ممالک میں مختلف گھروں سے پرانے مکینوں کی چھوڑی ہوئی اشیاء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آسٹریا میں کسی گھر میں مکین کو ہاتھ روم کی دیوار سے ایک کوریائی میزائل ملا۔ ایک امیر جرمن باشندے کو اپنے گھر کے تہ خانے سے جنگ عظیم کے دور کے ہتھیار ملے جن میں ایک نیک اور توپ بھی شامل تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے ملک چیک ری پبلک میں گھر کے اندر کسی کام کے سب کھدائی کی گئی تو کسی گرجا گھر کی چار صد سال پرانی گھنٹی ملی۔

لیکن یہ جرائی کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی اشیاء نکلتی رہتی ہیں۔

اور ایسی ہی کچھ اشیاء مجھے ماضی کی وادیوں میں لے جا رہی ہیں۔۔۔ نوشکی۔ بلوچستان کا ایک دور افتادہ مقام ہے جو تقریباً ایران جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ انگریزوں نے نہایت ہی منصوبہ بندی سے بنایا تھا۔ تمام سڑکیں گلیاں کشادہ اور ایک دوسرے کے سے قائمہ زاویہ بناتی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ 1954 - 55 کا زمانہ تھا۔ ہم اسی خوبصورت قبضے میں رہتے تھے۔ مکان کا نمبر بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ 102 تھا۔ انگریزوں نے اپنے لئے ایک ٹینس کورٹ بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر ہم خانے بنا کر اسٹاپو وغیرہ کھیلا کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو کافی تعداد میں تھے کیونکہ ارد گرد کے علاقوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ہندو اس تجارت کے کرتا دھرتا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کافی تعداد میں ہندو یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی ایک کافی تعداد رہ گئی تھی۔

ایک دن اباجان مرحوم نے گھر کے صحن میں کیاری بنا کر مختلف پھول لگانے کا ارادہ کیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی کی۔ ہم بچے بھی اباجان کا ساتھ دے رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر قریب ہی ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر نیچے گرا۔ میں چونک گیا کہ پوری مٹی میں پتھر نہیں تھا یہ کہاں سے نکل آیا۔ اسے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ بھائی جان جو قریب ہی کھڑے تھے انہیں بھی تجسس ہوا اور وہ بھی کام چھوڑ کر میرے قریب آگئے اور اسکی مٹی صاف کرنے لگے۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک گائے کی شکل کا کھلونا تھا۔

میں اس وقت چار پانچ برس کا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اس سے کھینا شروع کر دیا۔

اباجان مرحوم نے کیاری میں بیج بودے۔ ایک دو پھیریاں بھی اباجان مرحوم نے کہیں سے لا کر لگا دیں۔ ایک دو دن گزر گئے۔ ہم نے گائے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔

نہ جانے ہندوؤں کو کیسے اس کا علم ہو گیا۔

غالباً باقی مرحومہ یا بھائی جان میں سے کسی نے اسکول میں میں تذکرہ کیا تھا اور کسی ہم جماعت کو وہ گائے دکھائی بھی تھی۔ اس کے بعد تو ہندو خواتین کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا چیزیں لے کر آئیں، اور اس مقدس پوتر دھرتی جہاں سے لکڑی کی گائے نکلی تھی کے پھیرے لگاتیں۔ پھر کسی نادیدہ ہستی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتیں اور سر نہوڑائے بیٹھ جاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں کوئی اشلوک پڑھتیں۔ اس کیاری کی مٹی کو اپنی انگلی سے چھوئی اور نہ جانے کیا رسومات کرتیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی ہوتی تھی اسے ہلکی ہلکی آواز میں بجاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جب والدین نہ ہوں اس وقت آئیں اور اپنی رسومات ادا کریں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کا تو ہم بچوں کو علم نہیں تھا لیکن ان کے آنے سے ہم خوش بہت ہوتے تھے کیوں کہ وہ طرح طرح کی مٹھائیاں، لڈو وغیرہ پیتل کی تھالیوں میں رکھ کے لاتیں اور کیاری کے گرد ان کو لیکر گھومتے اور ہمیں بھی پرشاد ہے کہہ کر دیتی تھیں۔ ہمارا گھر تو ایک قسم کا مندر بن گیا تھا۔ بعد میں امی آئیں تو ہمیں بہت غصہ ہوتی تھیں۔ خیر بعد میں اباجان نے وہ گائے وہاں کے ایک معتبر ہندو کو دے دی تھی۔ ہندو اس مقام سے بہت سی مٹی بھی کھود کر لے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پوتر مٹی ہے۔ اس کے بدلے میں ہندوؤں نے کہیں اور سے مٹی لا کر ڈال دی تھی۔

اس طرح کا ایک قصہ ابن صفی (مشہور جاسوسی ناول نگار۔۔۔ عمران فریدی اور کیپٹن حمید کے کرداروں کے خالق) کے فرزند جناب احمد صفی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی میں نانا ابو کو جو گھر فوج کی طرف سے الاٹ ہوا وہ اس سے قبل کسی ہندو خاندان کا تھا جو ہجرت کر گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے بتایا کہ ایک کمرے کی دیوار دھری بنی ہوئی تھی اور اس پر ہاتھ مارتے تو جیسے برتنوں کے جھنجھٹانے کی آواز آتی تھی۔۔۔ نانا ابو کے سخت حکم کی وجہ سے کسی نے بھی اس دیوار کو نہ چھیڑا۔ بعد کو جب یہ مکان کسی اور کو بیچا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس دیوار کو توڑا تو اندر سے گر ہستی کا پورا سامان برآمد ہوا۔ شلڈ کسی کے جہیز کے لیے رکھا گیا تھا۔۔۔ اور نہ جانے اس سامان کے علاوہ کیا کیا لٹکا ہو جس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔۔۔ ہجرت کے زمانے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ جنگ اخبار کے کالم ”ناقابل فراموش“ میں بھی چھپا تھا۔ ایک مسلمان خاندان

بھارت سے ہجرت کر کے آیا تو اس خاندان کو کراچی میں کوئی فلیٹ الاٹ ہوا۔ وہ اس میں رہنے لگے۔ ایک دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے اور ہجرت سے پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہندو ہے۔ دو تین دن فلیٹ میں آتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے راز دارانہ انداز میں کہا کہ اس کے پاکستان آنے کا ایک مقصد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ محلے والے اس خاندان کے اخلاق، کردار اور ایمانداری کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس ہندو نے کہا کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اسے امید واثق ہے کہ مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اس تمہید کے بعد اس ہندو نے کہا کہ ہمارے کے وقت جب وہ ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے پاس بہت سا سونا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اسے لے جانا بہت دشوار تھا۔ آخر اس ہندو کو ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ سونا اسی فلیٹ میں چھوڑ دیا جائے اور بعد میں حالات صحیح ہو جائیں تو لے جائے۔ اس ہندو نے سونے کو باریک سی تار میں تبدیل کیا اور گھر کی چھت اور دیواروں میں بچھی ہوئی بجلی کی تاروں کے ساتھ ساتھ یہ سونے کی تار بھی بچھادی۔ اس ہندو نے کہا کہ اب اسکی بہن یا بیٹی کی شادی ہے اور وہ اس امید پر پاکستان آیا ہے کہ اسے اپنا سونا مل جائے گا

پاکستانی نے بغیر کسی تردد کے کہا ”مجھے تو اس کا علم نہیں لیکن جناب یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ بلا کسی تاہل کے اپنی امانت لے جا سکتے ہیں“

ہندوستان سے آئے ہوئے فرد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر آیا تھا کہ نئے مالک مکان کو اس میں سے نصف حصہ دے دے گا لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ خیر قصہ مختصر سابق مالک نے پوری رات لگا کر بجلی کی تاروں کے ساتھ لگا ہوا اپنا سونا نکال لیا۔ اس نے نئے مالک مکان کو ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی لیکن پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ شے جس کا مکان سے کسی طرح کا تعلق ہی نہیں بنتا وہ کیسے لے سکتا ہے۔

قصہ مختصر ہندوستانی باشندے نے سونے کی تاریں لیں۔ اس نے جانے کیا انتظام کئے تھے کہ بحیریت اپنے ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر بحیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دو مہینے بعد اس کی طرف سے شادی کا رڈ بھی آیا جس میں اس پورے پاکستانی خاندان کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

ناقابل فراموش میں شائع شدہ کہانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ غالباً 1960 یا 1961 کا قصہ ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ جب وہ مشرقی پنجاب یا بھارت کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور الاٹ شدہ مکان میں داخل ہوئے تو ایسے لگتا تھا کہ اصل مکین کہیں نزدیک ہی گئے ہیں۔ جانے والے ہندوؤں کو کامل یقین تھا کہ واپس اپنے گھروں میں آئیں گے

- قرہ العین حیدر اپنی کتاب ”روشنی کی رفتار“ صفحہ 116 پر لکھتی ہیں کہ جب اسپین سے مسلمان نکل کر مراکش پہنچ رہے تھے تو وہ اپنے اندلی گھر کی چابیاں مراکش میں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں انہیں امید تھی کہ واپسی ہوگی۔

§§§

---

